ثقافتی مادیت اور انتظار حسین کا افسانہ "استاد": ایک تنقیدی جائزہ

Cultural Materialism and Intizar Hussain's Short story "Ustad": A Critical Review

Dr. Usman Ghani
Senior Instructor Urdu, NUML, Islamabad
Email: ughani@numl.edu.pk *ORCID: https://orcid.org/0000-0002-8898-3798*

Abstract:

Wherever the word culture comes with anything, we should understand one thing immediately. The relevant thing now includes personal status, social values, habits, actions, ideas, beliefs, experiences, rituals, and religions. They will also try to establish their image in which society is breathing. That is why the recovery of culture in any great literature is a must because literature reflects society. Materialism; by removing oneself from spiritual and intuitive conditions, relying on mythological powers, the help of gods, and spiritual attitudes to understand the universe.Which can also be called the expression of external and internal forces in general terms. From here, some issues and ideas are clearly explained. Culture refers to knowing and understanding social values, and materialism refers to the denial of supernatural elements and powers and dependence on personal consciousness and will. Cultural materialism refers to the social values of belief, religion, and ritual, denying any supernatural power and self-reliance for self and society. The historical context theory studies the historical characters in fiction. While analyzing them, such aspects are brought out that the powerful character is seen suppressing and exploiting the weak character at the social level. In this way, we will immediately understand that any character who goes against any character with supernatural powers will try to wipe out his opponent. Thus, a cultural-materialistic conflict will begin among the historical characters. In the related short story "Ustad," the characters have also been evaluated in the same context. Every powerful character oppresses the weak. Therefore, this short story describes the theory correctly.

Keywords:

Cultural Materialism, Critical Theory, Society Giants, Marxism, Mythological Powers, Narrative and Anti-Narrative Characters, Short Story, Criminology, Resistance, Intizar Hussain

انتظار حسین کو اردو افسانے کی آبرو کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اردو کہانی کو ہر میدان میں عزت و وقار بخشا، چاہے وہ افسانہ ہو یا ناول، داستان ہو یا کوئی حکایت، یا پھر کہانی کی کہانی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ تراجم، کالم، مضمون، تنقید اور آپ بیتی جیسی اصناف بھی اپنی قلم رو میں شامل کیں اور ان میں کامیاب بھی ہوئے۔ موصوف اردو ادب میں اس لحاظ سے خوش قسمت ٹھہرے کہ ان کی زندگی میں

ہی ان پر پی ایچ۔ڈی اور ایم۔فل کے مقالے لکھے گئے اوران کے فن کی عظمت کو سراہا گیا۔ مختلف زاویوں سے ان کے فن پہ بات ہوئی اور ناقدین نے کئی نظریات کی عینکیں لگائیں بھی اور اتاریں بھی۔ مگراس مقالے میں جس حوالے سے انتظار حسین کے ایک افسانے "استاد" کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے گا اس حوالے سے ابھی تک افسانہ نگار پر نقد نہیں کیا گیا۔ یہ مقالہ "ثقافتی مادیت" یعنی Cultural Materialism کے تناظر میں مذکورہ افسانے کو پرکھے گا۔ مگر اس سے پہلے ثقافتی مادیت کے بارے میں مختصر جان لیتے ہیں۔

جہاں بھی جس بھی چیز کے ساتھ ثقافت کا لفظ آجائے تو ہمیں ایک بات فوری طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اب اس متعلقہ چیز پہ ذاتی حیثیت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اقدار، عادات، افعال، خیالات، عقائد، تجربات، رسومات اور دین ومذاہب بھی اپنی اپنی شبیہ قائم کرنے کی کوشش کریں گے جن میں معاشرہ سانس لے رہا ہے۔ اسی لیے کسی بھی بڑے ادب میں ثقافت کی بازیافت ایک لازمے کی حیثیت رکھتی ہے کہ ادب معاشرے کا عکس ہوتا ہے۔ اب ذرامادیت کے بارے جانیں تو اندازہ ہو گا کہ Materialism تو وہی ہے جسے ہم جانتے ہیں کہ مادہ پرستی؛ روحانی اور وجدانی کیفیات سے خود کو نکال کر، کائنات کی تفہیم وادراک کے لیے اساطیری طاقتوں، دیوتاؤں کی مدد اور وحیانہ رویوں سے نکل کر بلاواسطہ غور وفکر ہی مادیت پسندی اور "مادیت" کی اصل ہے۔ جسے عام لفظوں میں ظاہری وباطنی قوتوں کا اظہار وانکار بھی کہا جاسکتا ہے کہ روحانیات میں سئیات اور مادیات میں غیر سئیات کی تشکیل وکردار کی خصوصیات کو پرکھا جاتا ہے۔ یہیں سے کچھ معاملات و نظریات کی صریحاً وضاحت ہو جاتی ہے کہ ثقافت سے مراد کسی معاشرتی اقدار کو جاننا، سمجھنا اور مادیت سے مراد مافوق الفطرت عناصر اور طاقتوں کا انکار اور ذاتی شعور وارادے پہ انحصار۔ اب "ثقافتی مادیت" کی ترکیب پہ غور کریں تو اندازہ ہو گا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ معاشرتی اقدار میں عقائد، دین ومذاہب اور رسوماتی طور پر کسی بھی مافوق الفطرت طاقت کا انکار کرتے ہوئے اپنی ذات اور سماج کے لیے خود پہ انحصار کرنا ہی "ثقافتی مادیت" ہے۔ اب ذرا Peter Barry (مترجم: الیاس بابر اعوان) کے الفاظ دیکھیے:

"مادیت سے یہاں (ثقافتی مادیت کی تھیئری میں) مراد آئیڈیل ازم یعنی مہاآدرشی تصور کا مخالف تصور ہے جسے مادیت کہتے ہیں۔ آئیڈیل ازم یعنی مہاآدرشی تصور کے مطابق ارفع ثقافت ایک آزاد اور خود مختار روح اور ذہن کا ماحصل ہے جب کہ اس کے برعکس مادیت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ ثقافت مادی طاقتوں اور ذرائع پیداوار سے ماورا نہیں ہو سکتی۔"(1)

یعنی سیدھا سیدھا یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاشروں میں موجود خود ساختہ بڑے بڑے بیانیے اور غیر فطرتی کردار جو دہائیوں اور صدیوں سے یونہی چلے آرہے ہیں جو لوگوں کے رہن سہن اور عقائد پر اتنے حاوی ہو چکے ہیں کہ ثقافت کا ہی حصہ بن چکے ہیں، انھیں دیومالائی اور یزدانی تصرفات کے حامل مہاآدرشوں کے خلاف نظریے کو "ثقافتی مادیت" کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا پیراگراف کو پڑھیں تو بات وسعت اختیار کر جاتی ہے کہ جب کوئی ثقافت میں موجود کسی بھی طاقت ور بیانیے کو چیلنج کرے گا تو وہ طاقت ور حلقے آپ کے خلاف ہو جائیں گے اور یہیں سے پھر طبقات کی جنگ شروع ہو جائے گی۔ پھر یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی اگر طاقت ور گروہ مذہب کے علاوہ جاگیر دار، سرمایہ دار اور مل مالک ہوں۔ اگر ایسا ہے اور ایسا ہی ہے تو ہمیں فوری طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ "ثقافتی مادیت" میں مارکسی خیالات بھی درآئیں گے اور یہ ایک طرح کی مارکسیت پر مبنی تنقیدی تھیئری بن جائے گی۔ اسی لیے Peter Barry کو آگے چل کر کہنا پڑا: "مادیت پر یہ تصورات مارکسی تنقید سے مختلف نہیں ہیں اور شاید یہ (ثقافتی مادیت پسند) مارکسی تنقید اور ثقافتی مادیت میں کوئی واضح فرق کشید نہیں کرتے۔"(2)

کسی بھی فن پارے کو ثقافتی مادیت کی چار خصوصیات کے تناظر میں ہی پرکھا جاتا ہے۔ یہ چار خصوصیات Jonathan Dollimore and Alan Sinfield نے اپنے مضامین کے مجموعے Political Shakespeare کے پیش لفظ میں لکھی ہیں(3):

1. تاریخی تناظر (Historical Context)
2. تھیئریٹیکل طریق کار (Theoretical Method)
3. سیاسی عزم (Political Commitment)
4. متنی تجزیہ (Close Textual Analysis)

انتظار حسین کے بہت سے افسانوں پہ اس تھیئری "ثقافتی مادیت" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے مگر میں یہاں صرف افسانہ "استاد" پہ اس تھیئری کی پہلی خصوصیت کے حوالے سے بات کروں گا۔

انتظار حسین کو ساری عمر جس بات کا دکھ اور قلق رہا وہ ہجرت تھی جس کی وجہ سے اُنھیں اپنی زمین سے بچھڑنے کا ملال اور اپنی تہذیب کی بازیافت کا مسئلہ درپیش تھا۔ جس غم کا داغ کم ہونے کی بجائے وقت کے ساتھ ساتھ اور بھی گہرا اور شدید ہوتا گیا اور وہ اپنی ذات کی شناخت کے بحران کا شکار بھی ہو گئے۔۔ لہٰذا اندر اور باہر دو ہجرتیں ان کے ساتھ بیک وقت چلنے لگیں۔ دادی، نانی سے سن کے اور انجبناری کی گھریا سے سبق لے کر کہانی لکھنے والے مصنف کی ذات میں جس قدر گھاؤ گہرے ہوتے گئے اتنی ہی کروٹیں کہانی کی تہوں میں آنے لگیں، جس کو مزید تقویت علامت نے اور وقار اساطیر نے عطا کیا۔ مگر میرے پیشِ نظر افسانہ "استاد" انتظار حسین کی ابتدائی افسانہ نگاری کے دور سے تعلق رکھتا ہے اور یہ افسانہ مصنف کی پہلی کتاب "گلی کوچے" کا آخری افسانہ ہے جو نومبر 1951 میں لکھا گیا۔ یہ افسانہ ایک راوی کی زبانی بیان ہوا ہے جو شاید مصنف خود ہے۔ جس کی مختصر کہانی یہ ہے کہ ایک بدمعاش قسم کا طاقت ور شخص ہے جس سے ہر قسم کے اچھے برے، چھوٹے بڑے، امیر غریب اور سرکاری افسران تک ڈرتے ہیں جن میں پولیس افسر سے لے کر اسکول ہیڈ ماسٹر تک شامل ہیں۔ جس کے بہت سے چیلے چانٹے ہیں جو اس کی دھاک بٹھانے کے لیے مختلف طریقوں سے لوگوں کو ہراساں کرتے رہتے ہیں اور بدمعاش وقتاً فوقتاً خود بھی لوگوں کے سامنے اپنے جبر اور ظلم کا مظاہرہ کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی دہشت لوگوں کے ذہنوں پہ چھائی رہے۔ اس کی شاندار حویلی ہے جو اسی کی طرح اپنی سطوت اور تہذیبی رکھ رکھاؤ میں طاق ہے۔ جہاں لوگ آتے جاتے ضرور سلام پیش کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو انھیں استاد کی سختیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی بدمعاش کو لوگ ادب، ڈر، یا طنز سے استاد کہہ کر پکارتے ہیں، یا اس کے چیلوں نے اسے استاد کہہ کہہ کر اسی نام سے مشہور کر دیا ہے۔ اسی استاد کی تقسیمِ ہندوستان اور ہجرت سے پہلے جو رکھ رکھاؤ، دبدبہ، شان اور رعب تھا وہ اب ہجرت کے بعد بالکل ختم ہو گیا ہے اور استاد کے زوال کے ساتھ ساتھ حویلی پہ بھی زوال آ چکا ہے اور وہ اپنی شان و شوکت اور رونق کھو بیٹھی ہے۔ جیسے جوان سال الہڑ کے احمری رخساروں پہ جھریوں نے بسیرا کر لیا ہو۔

تاریخی تناظر (Historical Context) میں افسانہ "استاد" کا ثقافتی مادیتی پہلو:

چونکہ ثقافتی مادیت کا کہیں نہ کہیں نو تاریخیت (New Historicism) سے بھی تعلق ہے شاید اسی لیے مندرجہ بالا دونوں نقادوں نے ثقافتی مادیت کو دیکھنے، پرکھنے اور نقد کرنے کے لیے تاریخی تناظر (Historical Context) کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس پہلو میں ہوتا کچھ یوں ہے

کہ فن پارے میں تاریخی حوالے سے متشکل کرداروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور ان کا تجزیہ کرتے وقت ایسے پہلو سامنے لائے جاتے ہیں کہ طاقت ور کردار کمزور کردار کو دباتا ہوا اور سماجی سطح پر اس کا استحصال کرتا ہوا نظر آئے۔ اس طرح ہم فوراً سمجھ جائیں گے کہ جو کردار بھی کسی مافوق الفطرت طاقتوں کے حامل کسی بھی کردار کے خلاف جائے گا تو وہ اساطیری کردار اپنے مخالف کو مٹانے کی کوشش کرے گا اور یوں تاریخی کرداروں میں ایک ثقافتی مادیتی کشمکش شروع ہو جائے گی۔ Peter Barry (مترجم: الیاس بابر اعوان) اس ضمن میں رقمطراز ہے:

"ثقافتی مادیت کا مطلب یہ ہے کہ سابقہ ادبی مطالعہ جات میں جو چیز اخفارہ جاتی تھی وہ اس کو نمایاں کرے۔ خاص کر متن کو اپنی تاریخیت خود بحال کرنا ہوتا ہے اور اس طرح تاریخیت جس کو بحال کیا جائے گا اس ڈرامے (افسانے یا ناول) کو ایسے حوالوں اور مظاہر سے جوڑے گا جس میں طاقت ور کمزور کو دباتا کھائے گا۔"(4)

تاریخی طور پر دیکھیں تو انتظار حسین نے اس افسانے کے متن میں تاریخیت کو گوندھ ہی دیا ہے اور تاریخ اپنے وجود کے ساتھ متنیت میں ضم ہو گئی ہے۔ استاد کا کردار تاریخ میں کسی لیجنڈ اور ساگا سے کم دکھائی نہیں دیتا اور پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ استاد جیسے کردار کو ایک وفادار ساتھی "سگّا" بھی دستیاب ہے جو استاد کے کہنے پر جان دے بھی سکتا ہے اور جان لے بھی سکتا ہے۔ بنیادی طور پر استاد کے متوازی یہ کردار اپنی شان و شوکت کے ساتھ نکھرتا اور پرپُرزے نکالتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور پورے افسانے کی فضا اس کے ہی دم سے قائم نظر آتی ہے۔ اتنا جاندار کردار ہے کہ استاد کی عظمت کم ہو جانے پر بھی استاد کو ہمت اور بہادری پہ اکساتا رہتا ہے جبکہ استاد نے اپنے زوال کو قبول کر لیا ہے۔ یہی کردار استاد کے کردار کو تاریخی بناتا ہوا اسے ثقافتی مادیت کے میدان میں لا کھڑا کرتا ہے۔ کہانی کار کی تکنیک اتنی دلچسپ ہے کہ اس نے راوی کے ساتھ ساری گفتگو اور معاملہ اسی سگا کے ذریعے پایۂ تکمیل تک پہنچائے ہیں۔ یہاں تک کہ استاد کی موت ہو جاتی ہے مگر سگا اس کے بعد بھی قائم اور زندہ رہتا ہے اور بعد میں بھی استاد کی عظمت کو ہر ایک کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے اور راوی کو بھی روایت کرتا چلا جاتا ہے۔ سگا اپنے گرو "استاد" کا چیلہ اور خدمت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ خود بھی کسی نہ کسی حوالے سے ثقافتی مادیتی پہلو کا شکار ہے جو پختگی اختیار کر کے وفاداری کے قالب میں ڈھل چکی ہے۔

افسانے کے شروع میں ہی استاد کا ایک طاقت ور، لازوال اور مافوق الفطرت کردار پورٹریٹ کیا جاتا ہے۔ جس کو پڑھتے ہی قاری متجسس ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی معاشرتی طاقت اور رعب کا قائل ہونے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بڑی طاقت کا وجود ہو گا تو ہی کوئی اور طاقت چھوٹی کہلائے گی اور ان دونوں کے بیانیے ثقافتی مادیت کو جنم دیں گے۔ افسانے کے شروع سے اقتباس دیکھیے:

"سارے شہر میں ان (استاد) کی دھاک تھی۔ بڑے بڑے تیس مار خانوں کا ان کے نام سے دم خشک ہوتا تھا اور رئیسوں کی تو انہوں نے کبھی کوئی ہستی ہی نہ سمجھی۔ جس کسی نے ذرا اکڑ تکڑ کی اس کو بیچ بازار میں جوتے لگوا دیے۔ سیٹھ گوری شنکر بڑا نک چڑھا بنتا تھا۔ سو اس کی بہن کا اب تک پتہ نہیں ہے۔ رئیسوں ہی پہ کیا ہے۔ افسروں سے بھی وہ دب کے تھوڑا ہی رہتے تھے۔"(5)

یعنی استاد نامی شخص ایک بہت بڑا غنڈا اور طاقتور انسان ہے کہ جس کے سامنے کوئی بھی آدمی ٹھہر نہیں سکتا خواہ وہ نیک ہو، بد ہو یا پھر اچھا یا برا ہو۔ بس جو بھی جیسے بھی استاد کی عظمت اور طاقت کو للکارے گا استاد اس کا قلع قمع کر دے گا۔ گوری شنکر خود ایک سیٹھ ہے مگر اس نے استاد کی بات نہیں مانی جس کا ذکر افسانے کے متن میں موجود نہیں کہ استاد نے کیا ڈیمانڈ کی تھی۔ ممکن ہے کہ استاد نے سیٹھ سے کوئی بھتّہ مانگا ہو، یا کوئی غلط کام نکلوانے کے لیے سفارشی بننے کا کہا ہو، یا کسی غلط کام میں ملوث ہونے کا کہا ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ استاد نے اس

سے کوئی روپیہ پیسہ ادھار لیا ہو جس کو لوٹایا نہ گیا ہو اور واپس مانگنے پر سیٹھ کو دھمکایا گیا ہو اور وہ دھمکی میں نہ آیا ہو تو لہٰذا اس طاقت ور انسان استاد نے سمجھا کہ یوں تو لوگوں کے دلوں سے میرا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا تو اس سیٹھ کو ایسا سبق سکھاؤ کہ لوگ اس کے حالات سے عبرت پکڑیں۔ سو اسی لیے استاد نے اپنے غنڈوں اور چیلوں کی مدد سے سیٹھ کی بہن کو اٹھوالیا اور اب سیٹھ تو کجا پولیس کو بھی اس کی بہن کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ پولیس کے افسران تو خود استاد کے ہاتھ چومنے اور سلام کرنے حویلی تک آتے تھے۔ جس کا ذکر مصنف نے بھی کیا ہے۔ کوئی داروغہ اس وقت تک شہر میں رہ نہیں سکتا تھا جب تک وہ اپنا چارج لیتے ہی استاد کے در پہ آ کے حاضری نہ دے۔ مگر ایک داروغہ نے ایسا نہیں کیا اور مستزاد یہ کیا کہ استاد کے ایک چیلے اور کارکن کو مطلوبہ مجرموں کی فہرست میں ڈال دیا۔ جو سیدھا سیدھا استاد کی طاقت کو چیلنج تھا۔ تو ثقافتی مادیت کی تھیئری کے مطابق استاد کا اپنے خلاف اٹھنے والی آواز کو دبانا فرض بنتا تھا اور استاد نے ایسا ہی کیا۔ افسانہ نگار لکھتا ہے:

"مشن بھائی کہا کرتے ہیں کہ پہلے جو بھی داروغہ یہاں بدل کر آتا تھا پہلے استاد کو سلام کرتا تھا۔ ہاں جب پوربیا داروغہ بدل کر آیا تو اس نے استاد کو آ کر سلام نہیں کیا تھا۔ استاد دو تین دن تک چپ رہے مگر جب اس نے بدلُو کا نام نمبر دس کے بدمعاشوں میں لکھ لیا تو پھر انہیں تاؤ آ گیا۔ تاؤ آنے کی بات ہی تھی۔ اس میں تو استاد کی پارٹی کی ہیٹی تھی۔ بس فوراً پوربئے سے کہلا بھیجا کہ داروغہ کس ہوا میں ہو۔ کمبل ڈلوادوں گا۔۔۔۔ (حملہ کر کے پکڑنے کے بعد) بھائی کی وہ جوتا کاری کی کہ طبیعت ہری ہو گئی۔ پھر اسے ایک رسی سے پیڑ میں باندھ دیا اور سامنے گھاس دانہ ڈال دیا کہ اسے کھائے جا۔ بس یہ سمجھ لو سالا فوراً پانی مانگ گیا اور فوراً وہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔"(6)

یہاں ایک طاقت ور شخص کا طاقت کا بیانیہ اور بھی کھُل کر سامنے آتا ہے۔ مصنف اس کے کردار میں چھپی طاقت اور دہشت کو ابھارنے کی (شاید) دانستہ کاوش کرتا بھی دکھائی دیتا ہے کہ اگر استاد اس داروغے کے خلاف اقدام نہیں کرتا تو "اس کی پارٹی کی ہیٹی تھی۔" پھر اب کیا تھا، لگا دھمکانے اور ڈرانے۔ جب داروغہ نہیں ڈرا تو اس پہ اپنے غنڈوں سے حملہ کروا دیا اس کے حواری تو حملے کے وقت فوراً ہی اڑنچھو ہو گئے اور یہ بے چارہ پھنس گیا۔ اس کے بعد جو داروغے کے ساتھ ہوا وہی اصل میں ثقافتی مادیت کی کہانی ہے۔ جو سرِ عام دہشت پھیلاتے ہیں کہ آئندہ کوئی ان کے سامنے سر اٹھانے اور خلاف جانے کی سوچے بھی نہ اور لوگ اس واقعے سے عبرت حاصل کریں اور آواز اٹھانے والے اور ہمارے خلاف جانے والے شخص کے انجام سے بھی پناہ مانگیں۔ یہ طاقت ور کا بیانیہ ہے جو ثقافتی مادیت میں اور بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جب کسی تاریخی یا تاریخ ساز کردار کے اچھے یا برے پہلو پر پردہ ڈالا جاتا ہے یا پھر اٹھایا جاتا ہے۔

افسانہ نگار اس کے بعد ثقافتی مادیت کے نمائندہ کردار "استاد" کو اور بھی طاقت ور اور زمانے بھر میں ناقابلِ شکست اور لازوال بنا کر پیش کرتا ہے۔ جیسے سارے کا سارا متن استاد کے حق میں گواہی دینے لگتا ہے۔ جس سے افسانہ نگار کے اسلوب اور تکنیک کی بُنت اور بھی واضح ہو جاتی ہے اور تہہ در تہہ چھپے معنی سامنے آنے لگتے ہیں۔ استاد اپنے عصر کا ایک ایسا کردار ہے کہ جو معاصر منظر نامے میں ہر کھیل، مقابلے اور شغل میں طاق ہے کہ افضلیت اسی کے خانے میں اتری ہے۔ پتنگیں اڑانے میں سب سے آگے اور اونچی اسی کی پتنگ اور پتنگوں کے پیچ میں کبھی بھی استاد کی پتنگ نہیں کٹی۔ یہ بات اپنے شہر تک ہی نہیں رہی بلکہ جالندھر اور امرتسر سے بھی بڑے بڑے پتنگ باز آئے جنھوں نے استاد سے پیچ لڑائے مگر استاد کی پتنگ نہ کاٹ سکے اور آخر کار استاد کو واقعی استاد مانا، ہاتھ چومے، بیعت ہوئے اور اپنے شہر کی راہ لی۔ دنگل میں استاد کے پٹھوں (پہلوانوں) کی جیت ہر دفعہ یقینی تھی کہ یہ ممکن ہی نہ تھا کہ استاد کے پٹھے میدان میں اتریں اور فتح ان کے قدم نہ چومے۔ کیوں کہ استاد نے انھیں اپنی طرز، طریقے اور ذاتی خوراکی نسخوں سے موٹا تازہ کیا ہوا ہوتا تھا جو استاد کی ہی

حویلی کے مردانے میں قیام پذیر رہتے، وہیں کسرت کرتے اور کھاتے پیتے رہتے۔ محرم کے تعزیوں میں ہمیشہ استاد کا اکھاڑا سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور کوئی بھی اکھاڑا استاد کے اکھاڑے جتنا لنگر، نذر نیاز اور لوگوں کی سہولیات کا انتظام نہ کر پاتا۔ شبِ برات کی لڑائی میں بھی ہمیشہ استاد کی پارٹی ہی کی جیت ہوئی۔ یہاں لڑائی سے مراد مختلف قسم کے بارودی پٹاخے اور ہوائیوں کی تعداد اور معیار کے مقابلے کی بات ہے اور اسی موقعے پر کبھی کبھار پٹھے بھی لڑائے جاتے تھے۔ جس میں ممکن ہی نہیں کہ استاد ہار جائے۔

افسانے کے اس حصے میں ثقافتی مادیتی کردار "استاد" اپنے یزدانی تصرفات پہ کامل دسترس کا حامل نظر آتا ہے جو اسے مافوق الفطرت قوت بنا کر پیش کر رہا ہے۔

ثقافتی مادیت کے نمائندہ طاقت ور کرداروں میں کچھ حیران کن خوبیاں بھی ہوتی ہیں جو انھیں روحانی اور جذباتی طاقت بھی عطا کرتی ہیں۔ جس وجہ سے لوگ ظاہری اور باطنی، جسمانی اور روحانی، عقلی اور جذباتی ہر دو سطح پر ان کرداروں کے ساتھ جُڑتے بھی ہیں، ان کا دفاع بھی کرتے ہیں اور وقت آنے پر ان کے لیے جان بھی دیتے ہیں اور ضرورت پڑے تو جان لے بھی لیتے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ان طاقت ور کرداروں کے گروہوں کی اقسام کو جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے مطابق ان طاقت ور کرداروں کے گروہ تین قسم کے ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔

i. مذہبی طاقت ور کردار

ii. مجاز افسر طاقت ور کردار

iii. دولت مند طاقت ور کردار

اول؛ مذہبی طاقت ور کرداروں پہ مبنی گروہ ہم میں سے کسی سے بھی ڈھکا چھپا یا پرایا نہیں ہے۔ بل کہ یہ تو ہمارے گھر کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ اگر یوں بھی کہہ لیا جائے کہ اس گروہ کا تعلق ہمارے خطے میں روزافزوں ہوتا ایک بڑا بیانیہ ہے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس گروہ کے لوگوں کے پاس بڑے ہی دلکش اور پُرکشش ہتھکنڈے موجود ہیں کہ جس سے یہ کسی بھی شخص کو اپنے تصرف میں لا کر استعمال کر سکتے ہیں۔ اپنا مطیع بنا سکتے ہیں۔ اس گروہ میں ایک تسلسل ایسا بھی ہے کو جو اسے باقی گروہوں سے ممتاز کرتا ہے اور وہ ہے روحانیات پہ اجارہ داری۔ اب روحانیات کی وجہ سے اس گروہ کا دائرہ کار مزید وسیع ہو جاتا ہے اور اس میں صوفی، عالِم، پیر، درگاہ کا گدی نشیں اور ایک مسجد کا امام تک اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتا دکھائی دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان سب کا اعتقاد ہے ہی مافوق الفطرت قوتوں کی تسخیر پر۔ اس وجہ سے یہ گروہ خود بخود ثقافتی مادیت کے ذیل میں آجاتا ہے۔ لوگوں کی محبتیں، خلوص، ہمدردیاں اور جذباتی وابستگیاں سب سے زیادہ اسی گروہ نے ہمیشہ سے حاصل کی ہیں۔ ثقافتی مادیتی روشنی میں مارکسی نقطۂ نظر اتنا واضح ہے کہ لوگ اپنی غربت کے خاتمے کے لیے انھیں لوگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور ساتھ میں نذرانے بھی پیش کرتے ہیں جو زیادہ تر مالی شکل میں ہی ہوتے ہیں۔ اس سے مال لینے والا اور بھی مالدار ہوتا جاتا ہے اور مال دینے والا تو پہلے ہی غربت زدہ ہے، جس کے لیے یہ قوتیں پہلے ہی ماورائی تصورات کی حامل ہیں کہ نہ جن پہ وقت کا اطلاق ہوتا ہے، جو نہ بیمار ہوتے ہیں اور نہ ہی ان سے حساب کتاب ہو گا، دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ بل کہ ان مذہبی طاقت ور لوگوں کی طاقتیں اتنی زیادہ ہیں کہ خدا کے حضور بھی یہی لوگ ان کم تر، غریب اور بے سہارا لوگوں کے والی ہوں گے۔ یہی تصور ذرا تفصیل میں جا کر جنت و دوزخ، جزا و سزا اور عذاب و انعام کی بحثوں میں پڑ کر مزید تقویت حاصل کر لیتا

ہے۔ جو مذہبی طاقت وروں کو اور بھی طاقت کی کمک پہنچاتا ہے اور غریبوں کو مزید غریب، کمزور کو مزید کمزور اور گناہ گار کو مزید معتوب بنا دیتا ہے۔ جو جنت، انعام، جزا اور ثواب کی لالچ میں اس طاقت ور گروہ کے اتنے حامی بن جاتے ہیں کہ اپنے دلی، عقلی، جذباتی اور روحانی تعلقات انھیں سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ اب اگر کوئی بھی شخص یا کمزور آدمی اس طاقت ور گروہ کی اصلیت واضح کرنا چاہے، یا حق بات کہے یا پھر لوگوں پہ اس طاقت ور گروہ کی حقیقت آشکار کرنا چاہے تو یہی جذباتی لوگ متشدد ہو کر بپھر جاتے ہیں اور جان دینے اور لینے کو بالکل جائز اور کارِ ثواب سمجھتے ہیں۔

دوم؛ کسی بھی مجاز افسر کی طاقت کا اندازہ بھی ہم سب کو روز مرہ زندگی میں ہوتا رہتا ہے۔ جو شخص تو نوکری پیشہ ہے اسے مزید شرح کی ضرورت نہیں اور جو نوکری پیشہ نہیں انھیں بھی سرکاری و نجی دفاتر میں کام پڑتے رہتے ہیں، لہٰذا انھیں بھی مزید بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ مجاز افسریت کا طاقت ور گروہ کس قدر ایک "خداؤں کا جمگھٹا" ہے۔ جو بات بے بات خدائی قوتوں کا اظہار کرتے اور عملی جامہ پہناتے نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس چند اختیارات ہوتے ہیں مگر یہ ان کے اندر رہتے ہوئے بھی کیسے کیسے کارنامے انجام دیتے ہیں ان کی نظیر ملنا بھی محال ہے۔ یہ گروہ بھی بہت طاقت ور ہے اور بھینس بھینس کی بہن ہوتی ہے، کے مصداق ایک دوسرے کو سپورٹ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ان کے مفاد اور دشمن ایک ہی ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ گروہ در گروہ ہوتے ہیں کہ آپس میں بھی دشمنیاں پالتے ہیں اور تعلقات کو حدود سے ماورا جا کر نبھاتے ہیں۔ اس گروہ کی قلعی بھی اگر کوئی کھولنا چاہے تو آ بیل مجھے مار، والی بات ہے۔ بلکہ نچلا طبقہ جو ان کے ماتحت آتا ہے ان میں سے اگر کوئی سچ یا حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرے تو اس کے جیسے ہی مظلوم اسے چوکنا کرتے ہوئے سمجھانے لگتے ہیں کہ دیکھو! دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر لینا کوئی عقل مندی نہیں ہے بلکہ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ بجائے اس کے کہ سب مل کر اس طاقت ور شخص اور گروہ کا مقابلہ کریں، ایک دوسرے کو ڈراتے اور سمجھاتے رہتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی ادارے میں طبقاتی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جو اصلاً مار کسی تصور کو جنم دیتی ہے اور ہماری تنقید ثقافتی مادیت کو بیان کرتی ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے گروہ میں اضافہ کرنے کے لیے اور اپنے گروہ کو تقویت دینے کے لیے چھوٹے لوگوں کو نوازتے رہتے ہیں۔ سفارش سے کسی کو بھرتی کروالیا، کسی کا ناجائز کام کر دیا، کسی کے رشتے دار کا کام کر دیا، رشوت میں سے کچھ حصہ دے دیا، اچھی جگہ کھانا کھلا دیا یا کھانے کے پیسے دے دیے، عید وغیرہ پہ عیدی دے دی یا نئے کپڑے لے دیے اور سب سے بڑھ کر جذباتی وابستگی کے لیے یوں کیا کہ کسی نچلے طبقے کے ہاں ہوئی موت پہ افسوس کرنے یا جنازے کے لیے اس کے گھر یا آبائی علاقے میں چلے گئے۔ بیماری آنے پہ دوا کے پیسے دے دیے اور چھٹی بھی دے دی۔ یہ چند ایسی ہمدردیاں ہیں کہ جن سے کوئی بھی نچلے طبقے کا آدمی اپنی جان پر کھیل کر بھی اس گروہ کے لیے وہ سب کرے گا جس کی خواہش یہ طاقت ور گروہ کرتا ہے۔ اس گروہ کی ناجائز حرکتوں پہ پردہ ڈالنا یہ کمزور طبقہ اپنا فرض سمجھنے لگتا ہے۔ لوگوں میں ان کی سادگی، نیک دلی اور اچھائی کے چرچے کرنا اپنے منصب کا حصہ سمجھتا ہے۔ اور پھر اس طرح اس مجاز افسر طاقت ور گروہ کے پاس بھی بہت سے چیلے چانٹے ایسے جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی خاطر کچھ بھی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

سوم؛ دولت مند طاقت ور ایسے کردار بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہوتے ہیں مگر زیادہ نمایاں نہیں ہوتے یا کہیں کہیں یہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ معاشرے کا ہر امیر یا دولت مند آدمی برا نہیں ہوتا۔ بل کہ چند ایک لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہوتے ہیں جن کی امارت کا ذریعہ ہی ایسے کام ہوتے ہیں جو معاشرتی اقدار کی گراوٹ کا سبب بنتے ہیں اور

ماحول کو پراگندہ بنا دیتے ہیں۔ دولت مند امیر آدمیوں سے میری مراد ایسے وہ تمام لوگ جو بدمعاش ہیں اور وہ لوگوں کو اپنے دھن دولت کے رعب سے ڈرا دھمکا کر رکھتے ہیں، جب چاہتے ہیں کسی کو نقصان پہنچا دیتے ہیں، بہو بیٹی کو اپنے مفاد کے لیے اٹھالیا اور جب چاہا چھوڑ دیا۔ پولیس بھی ایسے لوگوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیوں کہ ان کی جڑیں بدمعاشی کی دنیا سے ہوتی ہوئیں جرائم پیشہ طاقت ور لوگوں کی زمین میں اتر جاتی ہیں۔ جو بہت گہرائی تک سرائت کر جاتی ہیں۔ ظاہر ہے جو ان کے خلاف جاتا ہے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیتے ہیں۔ ان کے پاس کھلا پیسہ آتا ہے اور یہ کھلا پیسہ ہی لوٹاتے ہیں۔ ان کی حویلیاں اور گھر بڑے عالیشان ہوتے ہیں۔ رقص، موسیقی اور ڈانس وغیرہ کی محفلوں کے دلدادہ ہوتے ہیں جہاں یہ دل کھول کر داد دیتے اور پیسہ لوٹاتے ہیں۔ کئی طوائفوں کے رقص انھی کی بدولت حرکت آمیز ہوتے ہیں اور کئی طوائفیں انھوں نے اپنی ملکیت بنا رکھی ہوتی ہیں۔ انھی لوگوں کو ذرا بڑے پیمانے پر دیکھیں تو جرائم پیشہ لوگوں کی فہرست شروع ہو جاتی ہے یہ تو اپنی دولت سے اچھے خاصے طاقت ور گروہوں کے مالک ہوتے ہیں کہ کئی بدمعاشوں کو انھوں نے ہی پال رکھا ہوتا ہے۔ یعنی سامنے تو وہ بدمعاش ہوتے ہیں مگر جرائم کی دنیا میں کرتا دھرتا کوئی اور ہی ہوتا ہے جو پیچھے بیٹھ کر کنٹرول کر رہا ہوتا ہے۔ ان کی رسائی حکومتی سطح تک بھی ہوتی ہے۔ ان سے ذرا مختلف مگر ایسے ہی لوگ بزنس مین بھی ہوتے ہیں۔ بس دونوں میں فرق یہ ہے کہ بزنس مین اپنی دولت کو وائٹ بنانے کے لیے لیگل اور قانونی کاموں کا بھی سہارا لیتا ہے جب کہ اندر کھاتے اس کے بھی کئی ایسے کام ہوتے ہیں جنھیں ہم کالا دھندہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ان کی اپروچ بھی حکومتوں میں ہوتی ہے یا یوں کہہ لو کہ کئی حکومتیں انھی کے دم قدم سے چلتی ہیں۔ یہی گروہ پالیسیاں بناتا ہے اور حکومت میں بیٹھے سرکاری افسران کو سرکار کے نام پر عوام کی بہبود کے لیے لاگو کر دیتے ہیں۔ یہ تینوں (بدمعاش، جرائم پیشہ اور بزنس مین) مختلف سطح کے لوگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے گہرے منسلک ہوتے ہیں کیوں کہ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے اور وہ ہے دولت جمع کرنا۔ اسی لیے یہ ایک دوسرے کو ہر صورت میں مدد بہم پہنچاتے ہیں اور حکومتیں تک بدلوا دیتے ہیں۔ اس طاقت ور گروہ کے خلاف آواز اٹھانا اصل میں اعلائے کلمۃ الحق ہے مگر ایسا کوئی کر نہیں سکتا اور جو کرتا ہے اسے کسی نہ کسی طرح دبا دیا جاتا ہے، مار دیا جاتا ہے یا پھر خرید کر راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے اور جو بکتا نہیں اسے بلیک میل کر کے ہمیشہ کے لیے ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔ اس طاقت ور گروہ کے لیے لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنا بہت آسان ہوتا ہے اور یہ بڑی آسانی سے کر بھی لیتے ہیں۔ مثلاً کوئی مسجد، اسکول، یونیورسٹی یا مدرسہ بنوا دیا۔ غریبوں کی بچیوں کی شادیاں کروا دیں۔ لنگر خانے کھلوا دیے۔ غریبوں کے بچوں کی اسکولوں کی فیس ادا کرنے کا بندوبست کر دیا۔ مگر جو اس گروہ کے سب سے چھوٹے درجے کے لوگ ہوتے ہیں وہ علاقائی بدمعاش ہوتے ہیں۔ جو اپنے گھروں میں بے سہارا لوگوں کو پالتے ہیں۔ انھیں سر پہ چھت دینے کے ساتھ ساتھ پیٹ بھرنے کو کھانا بھی دیتے ہیں۔ یہی لوگ ان بدمعاشوں کے لیے ہر طرح کا کام کرتے ہیں اور اپنی ہمدردیاں ان کے لیے سنبھال رکھتے ہیں۔ وقت آجائے تو جان پر بھی کھیل جاتے ہیں۔ کیوں کہ ان چیلے چانٹوں کو ایک بات کا یقین ہے کہ اگر ہمیں کچھ ہو بھی گیا تو میرا مالک میری فیملی کا بھی اسی طرح خیال رکھے گا جیسے اس نے ساری عمر میرا خیال رکھا ہے۔ نسل در نسل غریبوں کا پالنے کا یقین ہی ایسے لوگوں میں مالک کے لیے سچی محبت اور وفاداری پیدا کرتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ مالک ہی ہمیشہ امیر رہتا ہے اور غریب تمام تر مشکلیں اٹھانے اور اپنی نسلوں کی قربانیاں دینے کے باوجود بھی غریب رہتا ہے۔ یہ ہے وہ نکتہ اور اہم بات جو کسی بھی سمجھ دار آدمی کو مارکسیت کی طرف لے جاتی ہے۔ یہ غریب لوگ اپنے مالک کے ایک اشارے پہ ایسے ایسے بڑے کام کر جاتے ہیں کہ جس کو کرنے کے لیے مالک بھی دنوں تک سوچتا رہتا ہے۔ کیوں کہ دو یقین ہر وقت اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ نمبر ایک؛ کہ میرا مالک مجھے ہر مشکل، پریشانی اور نقصان سے بچا

لے گا اور قانون تو میرا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا۔ نمبر دو؛ کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میری فیملی کا خیال میرا مالک ضرور رکھے گا۔ انھی دو یقینوں کی وجہ سے جرم کا قد قانون سے اونچا ہو گیا ہے۔ نہ ہی قانون آج تک اپنے محافظ کو یہ دو یقین دے سکا ہے اور نہ ہی کوئی قانون کا محافظ قربانی دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ قانون کی ڈیوٹی ایک نوکری سمجھ کر انجام دیتا ہے اور شام کو شکر ادا کرتے ہوئے گھر چلا جاتا ہے۔

ہم اپنی متعلقہ کہانی "استاد" کو دیکھیں تو اس کے طاقت ور شخص استاد کا تعلق تیسرے گروہ سے ہے کہ جو اپنے علاقے کا بدمعاش ہے جس نے کئی لوگوں کو اپنی حویلی کی چھت کے نیچے پال رکھا ہے۔ جن سے وہ مختلف قسم کے کام لیتا رہتا ہے۔ ان میں سے ہی "سگّا" بھی ایک ہے جو اپنی وفاداری کو نبھاتے ہوئے اپنے مالک کے اشارے کا منتظر رہتا ہے اور ہر مشکل سے مشکل کام بخوبی انجام دیتا ہے۔ سگا، استاد کا سب سے خاص آدمی ہے جو ہر حوالے سے ایک بااعتماد حواری ہے۔ جس کی وجہ سے ہی استاد کی طاقت دوگنا ہو چکی ہے۔ اس لیے استاد کے مقابل اگر کسی اور طاقت نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو سگا کو خریدنے کی بھی کوشش کی۔ کیوں کہ اگر سگا بِک گیا تو استاد کی آدھی طاقت خود بخود ہوا ہو گئی۔ اس لیے ایک اور بدمعاش نے جب سگا کو اپنی وفاداری بیچنے کی بات کی تو سگا نے وہ سب کچھ جس ڈرامائی انداز میں آکر استاد کو بتایا وہ بھی سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ سگا کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ لوگ اس کو اس کے مالک یعنی استاد کے خلاف خریدنا چاہتے ہیں۔ آفر ہونے کے بعد استاد کی خدمت میں حویلی میں پہنچ کر سگا روتے روتے کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر اصل بات وہی ہے کہ جو بھی سگا کو رکھے گا اسے گھر اور مال دے گا۔ لہٰذا یہی کچھ سگا کو یہاں استاد کے ہاں بھی ملتا ہے تو دوسرے بھی اسے آفر کرتے ہیں گھوم پھر کے بات آپیسے پہ ہی جاتی ہے۔ اقتباس پڑھیے:

"سگا نے قدموں سے سر اٹھایا پیچھے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ "اجی بات یو ہے کہ وہ بھتنی والا بنے خان خلیفہ سالا مجھ سے یو کیوے ہے کہ استاد جب بزار میں نکلیں تو وِنکے ایک جوتی مار دے دو سو روپے دوں گا اور ایک مکان تیرے نام لکھ دوں گا۔""(7)

ان چھوٹے لوگوں کی وفاداریاں ایسے ہی بکتی رہتی ہیں اور یونہی طبقات کا استحصالی نظام اپنے جوبن کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ مگر سگا کی وفاداری کچھ زیادہ ہی اخلاص پہ مبنی ہے کہ بکا نہیں مگر اپنی اہمیت جتانے استاد کے پاس پہنچ گیا ہے اور ایک ڈرامائی انداز میں بات کرتا ہے اور سر استاد کے قدموں میں رکھے روتا جا رہا ہے مگر بتا نہیں رہا۔ جب استاد سختی سے اور جھڑک کر پوچھتا ہے تو بتانا شروع کرتا ہے۔ اپنی وفاداری پیسوں کے معاملے میں بھی ہمیشہ ایک نمبر رکھتا ہے۔ مصنف لکھتا ہے:

" سگا میں یہ بات تو لاکھ روپے کی تھی۔ کتنا ہی مال ہوتا اور کتنے ہی جان جوکھوں سے حاصل کیا ہوتا استاد کی اجازت کے بغیر کوڑی گھر لے کر نہیں جاتا تھا۔"(8)

پھر بھی سگا کی اہمیت پیسوں کے ہیر پھیر نہ کرنے کی وجہ سے ہی مانی جا رہی ہے کہ کہیں سے بھی کچھ مال اس کے ہاتھ لگتا تو سارا مال لا کر استاد کے حوالے کرتا۔ پھر استاد کی مرضی کہ جتنا اسے عطا کر دے اور یہی بات تو استاد کو اس میں لاکھوں کی معلوم ہوتی تھی۔ استاد کی مہربانیوں کی بدولت ہر بڑی سے بڑی مصیبت سے ٹکرانا اس کا وطیرہ بن چکا تھا اور استاد کا اک اشارہ پاتے ہی پہاڑ تک کو کھود کے رکھ سکتا تھا۔ کیوں کہ اس طاقت ور طبقے نے نچلے پسے ہوئے طبقے کو اس بات کا یقین دلا رکھا ہے کہ کچھ بھی کرو نہ قانون تمھارے خلاف حرکت میں آئے گا اور نہ ہی کسی مائی کے لال میں اتنی جرات ہے کہ تم لوگوں کو کچھ کہہ سکے۔ اگر کچھ ہو بھی گیا جان وان چلی بھی گئی تو فیملی کی ساری ذمے داریاں استاد کے ذمے۔ وفادار سگا کو اس بارے مکمل اطمینان تھا اسی لیے تو جان تک لینا اور دینا ایک اشارے کی مار تھی۔

"سگا میں کمال کی بات یہ تھی کہ دبنگ بہت تھا۔ استاد نے جس کے متعلق اشارہ کر دیا اسے بھرے مجمع سے اٹھا دیا۔ بے جگرا اور پھر استاد کے اشارے پہ جان قربان کرنے والا۔ استاد اگر کہتے کہ آگ میں کود پڑ تو آگ میں کود پڑتا۔ اگر کہتے کہ سمندر میں چھلانگ لگا دے تو سمندر میں چھلانگ لگا دیتا۔"(9)

وہی دو یقینوں والی وفاداری اور ہمدردی کا حصول۔ جو دولت مند لوگ چھوٹے لوگوں کو یقین میں پھانس کر بڑے سے بڑا کام بڑی آسانی سے نکلوا لیتے ہیں۔ جس کی بحثیں اوپر گزر چکی ہیں۔ سگا بھی استاد کے ہاتھوں یونہی استعمال ہو رہا تھا۔ اس بات کا عملی مظاہرہ تو سگا نے کئی بار کیا جس کا ذکر دو چار جگہ پہ افسانہ نگار نے بھی کیا۔ استاد اپنے مافوق الفطرت کردار سے واقف تھا اور اس کے وفادار بھی اسی بات کو حق جانتے تھے۔ اک اور استاد کی دہشت اور رعب سے دل لگانے والا اسکول میں فیل ہو گیا جس کا نام "شفو" تھا۔ روتا ہوا استاد کے پاس آ گیا تو استاد نے سگا کو کیا حکم دیا، دیکھیے:

"استاد نے اس (شفو) کے آنسو پونچھے اور بڑے پیار سے پوچھا کہ ہوا کیا۔ شفو نے گھٹنے پر سر رکھے رکھے کہا۔ "ہیڈ ماسٹر نے مجھے فیل کر دیا۔" استاد غصے سے آگے بھبھوکا ہو گئے۔ فوراً سگا کو ڈانٹ بتائی۔ "ابے او الو کے پٹھے۔ یاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ جا اس حرامزادے سؤر کے بچے کی خبر لے۔" سگا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چھوٹا سا ڈنڈا پاس پڑا تھا۔ اسے بغل میں دبا وہاں سے چل پڑا۔ اسکول کے قریب نالہ ہے نہیں وہاں جا کر کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہیڈ ماسٹر اسکول سے فارغ ہو ادھر سے نکلا۔ سگا نے سر پہ دو ڈنڈے رسید کئے اور پھر کولہیا بھر اسے نالے میں دے پٹخا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہیڈ ماسٹر نے اگلے سال ڈر کے مارے خود ہی شفو کو پاس کر دیا۔"(10)

یہ ایسے طاقت ور لوگ ہوتے ہیں کہ انھیں کسی کی عزت، توقیر اور مرتبے کا بھی لحاظ نہیں رہتا اور انھیں اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ کام کتنا غلط ہے یا کس قدر اصولوں کے منافی ہے۔ بس ان کے دل میں جو آئی کر ڈالی، حکم دے ڈالا، پٹوا دیا، اٹھوا دیا، مروا دیا، کام بند کروا دیا یا کسی کی عزت کو سر بازار اچھال دیا۔ یہ سب جس قدر دردناک اور دہشت پر مبنی ہو گا ان کی طاقت میں اسی قدر اضافہ ہو گا۔ یہ چھوٹے اور غریب لوگوں کا استحصال اس طرح بھی کرتے ہیں کہ ان کو چند پیسوں اور چیزوں کے بدلے خرید کر، ہمدردی سمیٹ کر عمر بھر کا غلام بنا لیتے ہیں۔ اس طرح یہ غریب آدمی نیک کام تو کجا اپنے کسی جائز کام کے لیے بھی سیدھا راستا نہیں اپناتا بلکہ ہمیشہ ہر معاملے میں اپنے آقا کی طرف ہی دیکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں بھی جب چاہوں، جو چاہوں حاصل کر سکتا ہوں۔ میرے سر پر میرے مالک و آقا کا ہاتھ جو ہے۔ یہ نچلے طبقے کو دبا کر رکھنے کی سب سے اچھی اور دل پذیر صورت ہے۔ جس سے ان کا استحصال بھی ہو اور وہ بے خبر بھی رہیں بلکہ آقا کے احسان مند بھی۔

ایسے بدمعاش اور آوارہ قسم کے اوباش لوگ ہی اپنے سے چھوٹوں کو دبا کے رکھتے ہیں ان کی نشانیاں جو اوپر گنوائی گئی ہیں وہ افسانہ نگار نے بھی ہو بہو بیان کی ہیں۔ شہر بھر کی طوائفوں سے بھی ان کا ذاتی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ جن پر یہ اپنا ہی حق سمجھتے ہیں اور وہ ان کی داسیاں اور رکھیل بننے میں بھی عزت و عظمت سمجھتی ہیں۔ مصنف نے استاد کے ایسے تعلق کے بارے بھی بات کی ہے:

"شہر کی طوائفوں کی تو خیر کوئی بات ہی نہیں تھی وہ تھیں ہی استاد کی چیلی چانٹی۔ استاد کے بغیر تو ان کے یہاں کوئی کرتب ہی نہیں ہو سکتا تھا۔"(11)

مصنف نے اس افسانے میں بھی اپنی پہلی کتاب "گلی کوچے" کے باقی افسانوں کی طرح ہجرت کے دکھوں اور غموں کو اپنے خاص اسلوب اور تکنیک میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی جھلک بار بار افسانے میں دکھائی دیتی ہے۔ استاد کی بدمعاشی اور استاد کی حویلی کی

عظمت ایک رعب و دبدبے کی علامت تھی مگر یہ سب تقسیم ہند سے پہلے ہی تھا۔ جہاں تقسیم نے بہت سی چیزوں کو بدل دیا تھا وہیں استاد کی بدمعاشی کو بھی گھن لگا دیا تھا اور وہ ایک گرتے ہوئے درخت کی طرح ہو گئے تھے کہ اپنے ہی سہارے سے گرنے والے تھے۔ حویلی کی عظمت بھی قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ حالانکہ یہی حویلی تھی جس کے چبوترے پہ استاد بیٹھتے تو ایک دربار کا سا ماحول بن جاتا اور کس کی جرات تھی کہ بغیر سلام کے گزر جائے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو استاد کو غصہ آجاتا اور ماتھے پہ بل پڑنے لگتے اور اس شخص پہ ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔

"مجال تھی کہ کوئی چبوترے کے سامنے سے گزرے اور سلام نہ کرے۔ کسی سے چُوک ہو جاتی تھی تو استاد کی تیوری پہ بل پڑ جاتے تھے۔"(12)

مگر اب تقسیم کے بعد حالات بالکل بدل چکے تھے۔ استاد اپنے زوال کو تسلیم کر چکے تھے۔ مگر ہجرت کر کے پاکستان نہیں گئے اور اپنی حویلی میں ہی پڑے رہے اور نوجوان پٹھوں کی جگہ حویلی میں اب بس دو تین بڈھے ہی پڑے کھانستے رہتے تھے۔ نوجوانوں کی جگہ بڈھوں کا بدل جانا بھی افسانے میں استاد اور اس کی حویلی دونوں کی عظمت، رعب اور دہشت کے زوال کی علامتی تفہیم ہے۔ مگر یہ سب کیسے اور کیوں ہوا؟ اس کی وجہ تقسیم ہند تو ہے مگر اس کے ساتھ اصل وجہ وہی مارکسی نقطۂ نظر بھی ہے کہ استاد جیسے یزدانی تصرفات کے حامل، لازوال شخص نے زوال اس لیے نہیں مانا کہ ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں، بلکہ اس لیے ان پہ زوال آگیا کہ ان کے پاس پیسوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا اور لوگوں کو دبانے کے ذرائع نہ صرف مفقود ہوئے بلکہ ختم ہی ہو گئے۔ پیسہ ہی سب پٹھوں اور وفاداروں کی ضرورت تھا جب استاد کے پاس نہیں رہا تو وہ سب اپنی اپنی ضرورت کے مطابق دوسرے شہروں یا پھر نئے ملک پاکستان میں ہجرت کر گئے۔ مصنف نے افسانے کے آخر میں ثقافتی مادیتی نقطۂ نظر کو مزید گہرائی میں بیان کیا ہے:

"استاد اپنی کوٹھری میں اب اکیلے ہی رہتے تھے۔ پٹھے ایک ایک کر کے سب چل دیئے۔ رہتے بھی کیسے استاد کا ہاتھ خود تنگ رہتا تھا۔ استاد نے کمایا بہت مگر رکھنا نہ جانا۔ جانے اتنا روپیہ کہاں سے آتا تھا اور کیسے آتا تھا۔ مگر جیسے آتا تھا۔ ویسے ہی جاتا تھا۔ استاد دونوں ہاتھوں سے روپے کی بکھیر کرتے تھے۔ مگر اب تو آمدنی کے وہ سلسلے ہی بند ہو گئے تھے۔ ان کے پٹھے ایک ایک کر کے جُل دے گئے تھے۔"(13)

اس اقتباس کو غور سے پڑھیں تو کتنی ہی باتیں ثقافتی مادیت کے بارے میں کھل کر سامنے آتی ہیں کہ استاد کا ہاتھ کیا تنگ ہوا کہ سب پٹھے ایک ایک کر کے ان کو چھوڑ کر چلے گئے۔ استاد بالکل اکیلے ہی اپنی حویلی کی کوٹھری میں پڑے رہتے تھے۔ مصنف نے جاتے جاتے استاد کی بدمعاشی کے غیر قانونی ذرائع آمدن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ استاد کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا تھا اور کیسے آتا تھا۔ آمدنی کے وہی سلسلے بند ہوئے تو سب ساتھی ایک ایک کر روانہ ہو گئے۔ صاف بات ہے کہ استاد کے پاس پیسہ تھا تو وہ ایک طاقت ور گروہ کا حصہ تھے۔ جیسے ہی پیسہ ختم ہوا، تقسیم نے کئی مشکلات کھڑی کر دیں اور غیر قانونی دھندوں کو چلانے کے راستے بھی بند ہوئے تو استاد کی آمدن بھی بند ہو گئی۔ آمدن بند ہوئی تو پیسے کی نسبت سے جڑے لوگ بھی کسی اور پیسے والے طاقت ور گروہ سے جا کر مل گئے۔

ثقافتی مادیت کے اس تاریخی تناظر (Historical Context) کی بابت لیے گئے اس تنقیدی جائزے میں صاف صاف پتا چلتا ہے کہ جب تک آپ کسی دولت مند طاقت ور گروہ کا مضبوط حصہ ہیں تب تک نچلے طبقے کو آپ دبا کر رکھ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کی ہمدردیاں اور

وفاداریاں بھی خرید سکتے ہیں۔ جیسے ہی آپ کے پاس پیسہ نہیں رہے گا اور آپ مالی لحاظ سے کمزور ہوں گے آپ کے تابع اور مطیع رہنے والے لوگ جنھیں آپ دبا کر رکھتے تھے یا اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتے تھے، وہ آپ کے ہاتھ سے نکل کر کسی اور طاقت ور گروہ کا حصہ بن جائیں گے۔

نوٹ: ثقافتی مادیت کے حوالے سے نقد کرنے کے لیے اس کی چاروں خصوصیات کے تناظر میں ہی مجموعی تاثر قائم ہوتا ہے۔ مگر اس مقالے میں ثقافتی مادیت کی صرف پہلی خصوصیت "تاریخی تناظر (Historical Context)" کے حوالے سے ہی نقد کیا گیا ہے۔

(References الھوامش)

[1]۔ الیاس بابر اعوان (مترجم)، بنیادی تنقیدی تصورات، از پیٹر بیری، براؤن بکس، علی گڑھ، انڈیا، 2019ء، ص192

Ilyas Babar Awan (Translator), Basic Critical Concepts, by Peterberry, Brown Books, Aligarh, India, 2019, p.192

[2]۔ ایضاً، ص192

Ibid, p192

[3]- Dollimore, Jonathan and Alan Sinfield. 1985. Political Shakespeare: Essays in Cultural Materialism. 2nd Edition. Manchester: Manchester University Press, 1994.P 15

[4]۔ الیاس بابر اعوان (مترجم)، بنیادی تنقیدی تصورات، ص191-192

Ilyas Babar Awan (Translator), Basic Critical Concepts, p.191-192

[5]۔ انتظار حسین، گلی کوچے، شاہین پبلشرز، لاہور، طبع اول 1952ء، ص259

Intar Hussain, Gully Koche, Shaheen Publishers, Lahore, First Edition 1952, p. 259

[6]۔ ایضاً، ص260

Ibid, p260

[7]۔ ایضاً، ص262

Ibid, p262

[8]۔ ایضاً، ص264

Ibid, p264

[9]۔ ایضاً، ص265

Ibid, p265

[10] ایضاً، ص265-266

Ibid, p265-266

[11]۔ ایضاً، ص266

Ibid, p266

[12]۔ ایضاً، ص268

Ibid, p268

[13]۔ ایضاً، ص270

Ibid, p270